نظیرؔ اکبر آبادی

جیسے جیسے اردو زبان ترقی کرتی گئی اردو شاعری بھی پروان چڑھتی گئی۔ ساتھ ساتھ اردو کے نئے نئے مرکز بھی قائم ہونے لگے۔ جب ان مرکزوں کی ایک پہچان قائم ہوگئی اور زبان، موضوعات یا اسلوب کی بنیاد پر ان مراکز کے ادب کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر دیکھا جانے لگا تو یہ مرکز دبستان کہلائے۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنو دو بڑے دبستان تھے اور دبستان دکن، دبستان عظیم آباد وغیرہ چھوٹے دبستان۔ زیادہ تر شاعر دہلی یا لکھنو میں سے کسی ایک دبستان سے متاثر رہے اور وہیں کے رنگ میں شاعری کرتے رہے۔ اس معاملے میں ایک اکیلی مثال اس شاعر کی ہے جس نے کسی دبستان کی پیروی نہیں کی۔ اپنی راہ نکالی، بالکل الگ لب ولہجہ اور الگ انداز کی شاعری کی اور اپنی ذات سے ایک دبستان بن گیا۔ یہ اکیلی مثال نظیرؔ اکبر آبادی کی ہے۔

نظیرؔ کا نام ولی محمد اور والد کا نام محمد فاروق ہے۔ پیدائش دہلی میں ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی خبر پا کر خاندان دہلی سے اکبر آباد یعنی آگرہ چلا آیا۔ اس طرح بچپن دلّی میں گذار کر بقیہ عمر آگرہ میں گذاری۔ پیدائش کا صحیح سن معلوم نہیں لیکن وفات 1830ء میں ہوئی اور عمر 100 سال کے آس پاس تھی اس لیے مانا جاتا ہے کہ نادر شاہ کے حملے کے آس پاس 1735ء میں پیدا ہوئے۔

نظیرؔ کی نوجوانی کے زمانے میں دلّی کئی بار اجڑ چکی تھی۔ دہلی کے بڑے بڑے شاعر دوسرے شہروں کا رخ کر رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں آگرہ قدرے پرسکون تھا۔ قبل میں اکبر کا دارالسلطنت رہنے اور برج کا علاقہ ہونے کی وجہ سے آگرہ تہذیبی اعتبار سے ترقی یافتہ شہر تھا۔ یہاں ہر مذہب، ہر پیشے اور ہر سطح کے لوگ بستے تھے۔ نظیرؔ نے یہیں کی گلیوں میں گھومتے ہوئے اپنی شاعری کا مواد اکٹھا کیا۔ یہاں کے سماج کا باریکی سے مشاہدہ کیا۔ لوگوں کے ذہن کو سمجھا، الگ الگ طبقے اور پیشے کے لوگوں کی زبان کے فرق کو محسوس کیا اور یہ سب جب ان کی شاعری کی شکل میں سامنے آئے تو لوگ چونک پڑے۔ ایسی شاعری کسی دبستان میں نہیں ہو رہی تھی۔ گھبرا کر لوگوں نے انکو شاعر تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ نظیرؔ خاموشی سے شاعری کرتے رہے۔ آگرے کے بچے بچے کی زبان پر انکے اشعار آ گئے۔ نظیرؔ نے اس زمانے میں رائج غزل، مثنوی، قصیدہ وغیرہ کے بجائے نظموں پر زیادہ توجہ دی۔ ان کی نظموں کے موضوعات زندگی سے سیدھے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ تخیل سے کم اور مشاہدے سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ الفاظ کا انتخاب بھی موضوع کے مطابق کرتے ہیں۔ اس طرح جو تصویریں سامنے آتی ہیں وہ حقیقی معلوم ہوتی ہیں۔ نظیرؔ کی کچھ نظموں کے عنوانات دیکھئے۔ 'آگرے کی ککڑی'، 'تربوز'، 'نارنگی'، 'پنکھا'، 'تل کے لڈو'، 'مکھیاں'، 'کورا برتن'، 'کبوتر بازی'، 'بلبلوں کی لڑائی'، 'گلہری کا بچہ'، 'ریچھ کا بچہ'، 'آگرے کی تیراکی' وغیرہ۔ نام سے ہی ظاہر ہے کہ ان نظموں میں مشہور ومقبول ہونے کی پوری گنجائش تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں آگرے کے پھیری والے اور خوانچہ والے بھی نظیرؔ کی نظمیں گا گا کر ککڑی، تربوز اور تل کے لڈو بیچتے تھے۔ یہاں تک

کہ فقیر بھی نظیر کی نظمیں گاتے ہوئے دروازوں پر آتے تھے۔ اسی طرح تیوہاروں پر نظیر نے جو نظمیں کہی ہیں وہ بھی دیکھنے لائق ہیں۔ عید اور شبِ برات کے علاوہ ہولی، دوالی، راکھی اور بسنت پر بھی انکی نظمیں موجود ہیں بلکہ ہولی پر تو سب سے زیادہ دس نظمیں ملتی ہیں۔ نظیر کی نظموں کی ایک بڑی خوبی ان کا بے ساختہ پن ہے۔ بغیر کسی بناوٹ اور مصنوعی آرائش کے وہ چیزوں کو جس کا تس رکھ دیتے ہیں۔ پڑھنے والا اپنے تجربے اور مشاہدے کے مطابق اس کا لطف اٹھاتا ہے۔ نظیر اس باریکی سے کسی بات کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتی۔ برسات پر ہر زبان میں بے شمار شاعروں نے نظمیں کہی ہیں لیکن نظیر کے علاوہ کسی نے مینڈک اور جھینگر تک کو یاد نہیں رکھا۔ ان کی نظم 'برسات کا تماشا' کا ایک بند پیش ہے:

ہر کوہ کی کمر تک سبزہ ہے لہلہاتا　　برسے ہے مینھ جھڑ اجھڑ، پانی بہا ہے جاتا
وحشی طیور ہر اک مل مل کے ہے نہاتا　　غوغا کریں ہیں مینڈک، جھینگر ہے غل مچاتا
اے یار چل کے دیکھیں برسات کا تماشا

ہر شاعر نے برسات کی خوبصورتی دیکھنے میں اور جتنی دیکھی اس سے زیادہ دکھانے میں اتنا دھیان دیا کہ ان چیزوں کی طرف ان کی توجہ بھی نہیں جو نظیر آسانی سے دیکھتے ہیں اور دکھاتے ہیں۔ نظم 'برساست کی بہاریں'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

سبزوں پہ بیر بھوٹی ٹیلوں اُپر دھتورے　　پسّو سے مچھروں سے روئے کوئی بسورے
بچھو کسی کو کاٹے کیڑا کسی کو گھورے　　آنگن میں کنسلائی کونوں میں کن کھجورے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

نظیر کو صرف برسات کی پھواریں نہیں دکھائی دیتیں، موسلا دھار بارش کی ہیبت بھی دکھائی دیتی ہے۔ ٹپکتے ہوئے چھپر، گرتے ہوئے مکان، پھسلتے ہوئے آدمی، بجھے ہوئے چولھے اور بھیگ کر ٹھٹھرتے ہوئے لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظیر کی نظموں کی فضا خالص عوامی اور خالص ہندوستانی ہے۔ ان کی کوئی بھی نظم ہو اس کو پڑھتے ہوئے ہمیں اس کی تصویریں اپنی آنکھوں کے آگے دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ان کی فضا جانی پہچانی ہوتی ہے۔ اس کے الفاظ لغت سے نہیں زمین سے لیے گئے ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ نظیر الگ کھڑے ہو کر یہ باتیں نہیں کہتے خود بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ برسات میں جب وہ پھسلن کا ذکر کرتے ہیں تو اپنے پھسلنے کی بات کرنا بھی نہیں بھولتے۔

کچھ ایسے موضوعات بھی ہیں جن پر زیادہ تر شعرا نے شعر کہے ہیں لیکن نظیر نے اسی موضوع کو اس طرح اٹھایا ہے کہ بات بالکل نئے انداز میں سامنے آتی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی یا ناپائداری ایسا ہی موضوع ہے۔ نظیر نے اس موضوع پر کم از کم 15 نظمیں کہی ہیں۔ مشہور نقاد کلیم الدین احمد لکھتے ہیں:

''نظیر بے ثباتی دنیا کے نظارہ سے اس قدر متاثر ہوئے ہیں کہ وہ بار بار تنبیہہ کرتے ہیں، ہر مرتبہ نئے رنگ سے، اس لیے تکرار سے بدمزگی پیدا نہیں ہوتی۔ بعض نظمیں اس موضوع پر بے حد موثر ہیں اور اردو شاعری میں ان کی مثال نہیں

ملتی۔ 'بنجارہ نامہ' اسی قسم کی نایاب اور پر اثر نظم ہے۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا　　قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا

کیا بدھیا بھینسا، بیل، شتر، کیا گوئیں، پلّا، سر بھارا　　کیا گیہوں، چاول، موٹھ مٹر، کیا آگ دھواں کیا انگارا

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

ہر بند میں پانچویں مصرع کی تکرار دل پر عجیب اثر پیدا کرتی ہے۔ اس تکرار سے فنا کی شکل دل میں نقش ہو جاتی ہے۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر)

نظموں کی ہی طرح نظیؔر نے غزلوں میں بھی اپنی راہ نکالی۔ الفاظ اور محاورات کا استعمال بھی اپنے انداز پر کیا۔ رائج طریقے کے برخلاف انہوں نے مسلسل غزلیں بھی بڑی تعداد میں کہیں، جن میں ایک ہی موضوع پر سارے اشعار ایک ترتیب سے ہوتے ہیں اور یہ نظم کے بہت قریب آ جاتی ہے۔ سب سے بڑی خوبی ہے کہ ان کی غزلوں کی فضا بھی ہندوستانی ہے، فارسی شعرا سے متاثر ہو کر ایرانی نہیں۔ یہ خوبی ولی دکنی وغیرہ شروع کے شعرا میں موجود تھی جو دھیرے دھیرے ختم ہوتی گئی۔ نظیؔر کی غزلوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ سات سو سے زاید غزلیں کلیات میں شامل ہیں۔ غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

بحر ہستی میں صحبتِ احباب　　یوں ہے جیسے بہ روئے آبِ حباب

فرصتِ عمر، قطرۂ شبنم　　وصلِ محبوب، گوہرِ نایاب

میرا اور اس کا اختلاط ہو گیا مثلِ ابر و برق　　اس نے مجھے رُلا دیا میں نے اسے ہنسا دیا

میں ہوں پتنگ کاغذی، ڈور ہے اس کے ہاتھ میں　　چاہا ادھر گھٹا لیا، چاہا ادھر بڑھا دیا

شام کی صبح ہوگئی دم میں　　یہ تو کچھ ہم نے خواب سا دیکھا

نہ گل اپنا نہ خار اپنا، نہ ظالم باغباں اپنا　　بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

حقیقت یہ ہے نظیؔر کی غزلوں کا بھی اچھا خاصہ سرمایہ اردو کے بڑے سے بڑے شاعر کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیم الدین احمد کہتے ہیں:

''اردو شاعری کے آسمان پر نظیؔر کی ہستی تنہا ستارہ کی طرح درخشاں ہے۔''

****